بسم الله الرحمن الرحیم

شہید آیت اللہ مُرتضیٰ مطہری کی

ایک لاجواب تقریر کا خلاصہ

شہید

مترجم

ڈاکٹر سیّد تقی حسن عابدی

نام کتاب : شہید

تالیف : استاد شہید مرتضیٰ مطہری

ترجمہ : ڈاکٹر سید تقی حسن عابدی

ناشر : سازمان تبلیغات اسلامی (روابط بین الملل)

بار : دوم ۱۹۸۷

تعداد : تین ہزار

تاریخ : ذی القعدہ ۱۴۰۷

کتابت : قلبی حسین رضوی

فہرست

صفحہ

مقدمہ

یہ کتاب شہید آیت اللہ مطہری کی ایک لاجواب تقریر کا ترجمہ ہے جسے آپ نے شب عاشورہ ارشاد فرمایا تھا۔ اگرچہ اس تقریر کا کئی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے لیکن یہ اس تقریر کا اُردو میں پہلا ترجمہ ہے جو ناظرین گرامی مخصوصاً نوجوانوں کے استفادہ کی خاطر آسان اور مثبت اُردو میں کیا گیا ہے۔

قارئین محترم اس کتاب کے مطالعہ سے اس نتیجہ کو حاصل کریں گے کہ شہید مطہری نہ صرف ایک ماہر مقرر بلکہ فارسی ادب کے معروف ادیب، بڑے مجتہد اور اسلامی علوم کے مشہور فلاسفر تھے جنھوں نے اپنی زندگی کے تمام لمحات کو حتیٰ کہ اپنے خون کے آخری قطرے کو بھی اسلام کی خدمت کیلئے وقف کر دیا تھا۔ آپ کی ناگہان شہادت اسلام کے لیے عموماً اور شیعیان جہان کے لیے خصوصاً بہت بڑا نقصان تصوّر کی جاتی ہے۔

آپ کی کوئی تینس ۳۰ جلد کتابیں ابھی تک شائع کی گئی ہیں اور ابھی کوئی بیس ۲۰ جلد کتابیں عوام کے استفادہ کے لیے چھاپی جا رہی ہیں، بعض مشہور کتابوں کا انگریزی، عربی اُردو اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔

آپ کی مشہور کتاب "داستان راستان"، کو یونسکو آرگنائزیشن آف ورلڈ کی جانب سے سال ۱۹۶۵ء کی بہترین کتاب قرار دیا گیا۔

شہید مطہری کی شخصیت نائب امام امام خمینی کے اُن جملوں سے ظاہر ہوتی ہے جنھیں آپ نے

مرحوم کی شہادت پر بیان فرمایا۔ "میں نے ایسے پیارے فرزند کو جو میرے دل کا ٹکڑا تھا کھو دیا ہے وہ میری زندگی کا ثمر حساب کیا جاتا تھا" اور حقیقت بھی یہی ہے جس کا اقرار خود شہید مطہری نے اپنی متعدد کتابوں میں کیا ہے کہ ان کی تمام تجلیاں اور تحقیقات ان کے اُستاد نائب امامؑ امام خمینی کے فیض و برکت کی وجہ سے ہیں۔

بندہ کو اس مقام پر فخر حاصل ہے کہ اسلامی دُنیا کے ایک بڑے فلاسفر، ادیب اور مجتہد کی ایک چھوٹی سی تقریر کا ترجمہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، اگرچہ میں نہ کوئی اُردو ادب کا ادیب ہوں اور نہ فن ترجمہ کا ماہر، لیکن اس امرِ دشوار کی کوشش کی تاکہ ناظرین محترم اس بڑے دانشمند کے خیالات اور افکار سے واقف ہو جائیں۔ مطلب کو حتی الامکان آسان اور عام الفاظ میں ادا کیا گیا ہے، چنانچہ اگر ادب یا انشار کی غلطی پیش آئے تو نظر انداز فرمائیے گا۔

اگر خداوند عالم کی توفیق برقرار رہے تو انشا اللہ جلد ہی دوسری کتابوں کے ترجمہ کو قارئین کی خدمت میں پیش کروں گا۔

میں اس مقام پر سازمان تبلیغات اسلامی شعبۂ روابط بین الملل کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جن کی محنتوں اور محبّتوں نے اس کام کو جامۂ عمل پہنایا۔

والسلام علی من اتبع الھدیٰ

ڈاکٹر سیّد تقی حسن عابدی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ

شہید کی عظمت

دُنیا کی نظر میں عموماً اور مسلمانوں کی نظر میں خصوصاً بعض الفاظ یا کلمات مقدس اور عظیم تصوّر کیے جاتے ہیں۔ جیسے عالم، مجتہد، اُستاد، فلسفی، عابد، زاہد، مجاہد، مومن، صدیق، مہاجر، ولی، امام، نبی وغیرہ وغیرہ۔ یہ الفاظ لفظ ہونے کی وجہ سے عظمت واحترام کے حامل نہیں بلکہ اپنے معنی اور مفہوم کی بنا پر عظیم اور مقدس سمجھے جاتے ہیں۔

دُنیا کے تمام اجتماع اپنے لیے تقدسات اور تبرکات کے قائل ہیں جو ایک دوسرے سے اپنے اندازِ فکر، طرزِ بیان اور نتائج میں اختلاف رکھتے ہوئے بھی اپنی جگہ خود ایک فلسفیانہ اور طویل بحث ہیں۔ جو افراد مکتبِ اسلام سے آشنا ہوں اور قوانین و مفاہیم اسلامیہ کو اچھی طرح سے جانتے ہوں، وہ اس امر کا بخوبی احساس کرتے ہیں کہ شہید ایک لفظ معظم اور منور ہے جس کو نور کی شعاعیں احاطہ کئے ہوئے ہیں، یہ لفظ تمام ادیان اور اقوام کی نظر میں مقدس اور عظیم سمجھا جاتا ہے، اگرچہ اس کے معیار اور ضوابط میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

اسلام کی نظر میں جب کوئی شخص درجہ شہادت پر فائز ہوتا ہے تو اسلام اُسے اپنے معیار اور قواعد کے تحت شہید کہتا ہے یعنی اگر کوئی فرد، خدا کی راہ میں، مقاصد اسلامی کی خاطر اور انسانیت کی آبرو برقرار رکھنے کے لیے اپنی جان فدا کر دیتا ہے تو اسلام اُسے عالی ترین درجات اور مراتب سے نوازتا ہے۔ تفسیر قرآن، تعبیرات احادیث اور روایات اسلامی جو اس ضمن میں وارد ہوئی ہیں وہ لفظ شہید کے مقدس اور عظیم ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

شہید کی حق سے وابستگی

قرآن مجید شہید کی حق سے وابستگی کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے :-

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ

خیال نہ کرنا کہ جو لوگ خُدا کی راہ میں شہید ہوئے ہیں وہ "مردہ" ہیں بلکہ وہ ہمیشہ "زندہ" ہیں اور اپنے پروردگار سے رزق حاصل کرتے رہتے ہیں۔

دین اسلام میں کسی شخصیت کی تعریف یا اس کے کام کی قدر و منزلت کو بتلانا ہو تو کہتے ہیں فلاں شخصیت کا مقام شہید کے رتبہ کے برابر ہے یا فلاں شخصیت نے جو نیک کام کیا ہے اس کا ثواب شہید کے ثواب کے مساوی ہے۔ مثال کے طور پر طالب علم حقیقی جس کا مقصد صرف عوام کی خدمت اور تقرب خُدا ہو اور علم کو اپنے حرص اور طمع کا وسیلہ نہ بنائے تو اُس کی بابت ارشاد ہوتا ہے کہ اگر یہ علم حاصل کرنے کے دوران مر جائے تو اس دُنیا سے شہید اُٹھے گا۔

یہ مسئلہ دینِ اسلام میں علم کی قدر اور طالب علم کی منزلت کو آشکار کرتا ہے۔ اسی طرح جس نے اپنے گھر کے کاروبار اور اپنے اہل و عیال کے مسائل کو حل کرنے کے لیے محنت اور مشقت برداشت کی ہو (اگرچہ اسلام نے اس کو ایک اہم فریضہ قرار دیا ہے کیونکہ اسلام بیکاری اور کاہلی کا سخت مخالف ہے) تو اس کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: اَلْکَادُّ لِعِیَالِهٖ کَالْمُجَاهِدِ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ:

جو شخص اپنے اہل و عیال کے لیے محنت اور زحمت کرے اور مشقتیں اُٹھائے اُس مجاہد کی طرح ہے جو خُدا کی راہ میں جہاد کر رہا ہو۔

شہید کا حق انسانیّت پر

دُنیا کی تمام شخصیتیں جنھوں نے کسی بھی طریقہ سے انسانیت کی خدمت کی ہو، انسان کی گردن پر اپنا حق اور احسان رکھتی ہیں مثلاً کسی نے علم، کسی نے فکر و فلسفہ، کسی نے صنعتکاری

کسی نے ایجاد اور کسی نے اپنے اخلاق اور حکمت عملی کے ذریعۂ انسان کی خدمت کی ہے (تو انسانیت پر اس کے حقوق ہیں) لیکن کسی بھی نامور شخصیت نے شہید کی طرح انسانیت پر اپنا حق اور احسان نہیں رکھا، شاید یہی وجہ ہے کہ حق شناس اور سمجھدار انسان نے شہید کو ایک خاص مقام اور اُس کی شہادت کو ایک خاص جذبہ اور احترام کے ساتھ قبول کیا ہے آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ شہیدوں کا حق اور ان کا احترام دوسری شخصیتوں کی نسبت زیادہ اور عظیم ہے؟ ہاں! اس کی دلیل ہمارے پاس موجود ہے دیکھئے تمام ایسے اشخاص، جنھوں نے بشریت کی خدمت کی ہے، شہیدوں کے شکر گزار ہیں لیکن اس کے برخلاف شہداء ان کے شکر گزار نہیں کیونکہ یہ ایک امر مسلم ہے کہ ایک عالم اپنے علم میں، ایک فلسفی اپنے فلسفہ میں، ایک اُستاد اخلاق اپنے درس اخلاق میں ایک آزاد اور ساز گار معاشرے کا محتاج ہے تاکہ اپنی خدمات کو انجام دے سکے لیکن شہید بالکل اس قسم کے اجتماع ساز گار کا محتاج نہیں کیونکہ شہید اپنی زندگی کو فدا کر کے، اپنے بدن کو خاک وخون میں غلطاں کر کے انسانیت کے لیے چراغ ہدایت نصب کرتا ہے۔

شہید کی شخصیت کو ایک شمع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کا محبوب مشغلہ خود کو جلا کر، خود کو فنا کر کے روشنی اور نور کو پھیلانا ہے تاکہ بشر اس نور اور روشنی کی بدولت اپنی زندگی کے کاروبار کو اچھّی طرح سے انجام دے سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شہداء بزمِ انسانیت کی شمع ہیں جن کا کام فنا ہو کر انسانیت کی محفل کو روشن کرنا ہے کیونکہ اگر یہ محفل اندھیری رہ جائے تو انسان کوئی بھی مثبت کام انجام نہیں دے سکتا۔ لیکن افسوس کہ انسان دن میں آفتاب کی روشنی کی بدولت یا رات میں چراغ کے نور کی بدولت زندگی کے کاموں کو مکمّل کرتا ہے، ہر مسئلہ پر غور و فکر کرتا ہے لیکن اس مبدء نور یعنی آفتاب یا چراغ پر توجہ نہیں دیتا، اگر یہ نور اور روشنی نہ ہوتی تو تمام کام نامکمّل اور ناتمام رہ جاتے، لہٰذا معلوم ہوا کہ شہداء نور اور روشنی کے تابناک مجسمے ہیں، اگر اُن کا نور

اور روشنی نہ ہوتی تو ظلم و جبر کی تاریکی انسان کو تمدن تک پہنچنے ہی نہ دیتی۔

خُداوند عالم نے سورۂ احزاب میں اپنے حبیب پیغمبرؐ اکرم کو "سراج منیر" کہہ کر پکارا ہے یعنی چراغ نورانی۔ ارشاد ہوتا ہے : یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۝ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝

اے پیغمبر ہم نے تم کو بھیجا ہے گواہ بنا کر، اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور باذن خُدا دعوت دینے والا حق کی طرف اور نورانی اور درخشاں چراغ بنا کر اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانانِ جہان جنھوں نے تہذیب اسلام کو اپنایا ہے لفظ شہید اور اس کے مفہوم کو دوسرے کلمات کی نسبت باعظمت سمجھتے ہیں، یعنی لفظ شہید ان کے ذہنوں میں ایک لفظ مقدس اور نورانی ہے۔

شہید کے جسم پاک کی اہمیّت

اسلام دین حکمت و منطق ہے۔ تمام احکاماتِ اسلام حکمت و منطق، اور رازونیاز بشر سے بھرپور ہیں۔ ان احکامات کے مطابق اگر کوئی مسلمان مرجائے، تو دوسرے مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس کی میّت کو غسل و کفن دے کر اس پر نماز میت پڑھیں اور پھر دفن کریں، لیکن اس حکم میں ایک استثنا ہے۔ اور وہ ہے شہید!۔ یعنی شہید کے بارے میں حکم ہے کہ صرف نماز پڑھ کر اُسے دفن کریں غسل و کفن کی مطلقاً ضرورت نہیں چونکہ شہید کی روح کا مرتبہ اتنا بلند و بالا ہے کہ اس کے اثر سے شہید کا بدن پاک اور اس کا پہنا ہوا لباس اگرچہ خون میں غلطاں ہو طاہر اور پاکیزہ ہو جاتا ہے شہید کا جسم ایک "تن پاک" ہے یعنی شہید کا جسم روح کی طرح لطیف اور پاک ہے۔ جس طرح روح کے لیے غسل و کفن لازم نہیں اُسی طرح جسد شہید کے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں، چنانچہ اسی لیے شہید کو جس نے خُدا کی راہ میں اپنا سر پیش کیا ہے، غسل و کفن دیئے بغیر خاک و خون

سے بھرے ہوئے لباس میں دفن کیا جاتا ہے۔

یہ احکامات فقہ اسلامی میں مخصوص ہیں جو دینِ اسلام میں شہید کا مرتبہ اور اس کی منزلت کو بتلاتے ہیں۔

فلسفۂ شہادت

شہادت میں، شہید کا مقام صرف قتل ہونے کی وجہ سے اہمیت کا باعث نہیں بنتا اس دُنیا میں ہر روز کئی افراد کسی مقصد کے بغیر مفت قتل کیے جاتے ہیں جنھیں عام زبان میں ان افراد کی بدقسمتی اور تقدیر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس طرح کے مرنے سے انہیں کوئی امتیاز یا افتخار حاصل نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات اس قسم کی موت ذلت اور حقارت کا باعث ہوتی ہے۔

اس مقام پر ضروری سمجھتا ہوں کہ مسئلہ موت کو واضح طور پر بیان کروں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ موت یا انتقال کی کئی قسمیں ہیں۔

۱۔ **موت طبعی**: انسان اپنی عمر کے مراحل کو طے کر کے ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے کہ اُس کا بدن زندگی کے فرائض یا امور کو ٹھیک طریقہ سے انجام نہیں دے سکتا اور آخرکار اس دُنیائے فانی سے کوچ کرتا ہے جسے ہم موت طبعی کہتے ہیں۔ ایسی اموات نہ قابل امتیاز ہوتی ہیں اور نہ قابل ملامت اور ان پر لوگ بھی زیادہ افسوس نہیں کرتے۔

۲۔ موت کی دوسری قسم۔ موتِ اخترامی یا ہلاکت ہے یہ موت غمگین کنندہ اور دوسروں کے لیے افسوس کا باعث ہوتی ہے جو عموماً بیماریوں مثلاً ہیضہ، طاعون، ملیریا وغیرہ یا قہرِ الٰہی مثلاً زلزے، سیلاب، طوفان وغیرہ کی وجہ سے پیش آتی ہے۔ یہ اموات قابلِ امتیاز یا قابلِ ملامت نہیں سمجھی جاتیں، بلکہ ان اموات کو ان افراد کی تقدیر یا بدقسمتی کہہ سکتے ہیں۔

۳۔ موت کی تیسری قسم کسی بے گناہ کا قتل ہے یعنی مقتول بے گناہ ہوتا ہے اور قاتل صرف اپنے فائدہ یا حسد کی خاطر مقتول کو اپنا نشانہ بناتا ہے اس قسم کے واقعات کو ہم ہر روز اخباروں،

اور رسالوں میں پڑھتے ہیں کہ فلاں عورت نے اپنے سوتیلے بچے کو صرف اس لیے موت کے گھاٹ اُتار دیا کہ اُس کا شوہر اس بچے کو بہت پیار کرتا تھا، یا فلاں شخص نے اپنی معشوقہ کو شادی سے انکار کرنے پر قتل کر دیا۔ تاریخیں ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں کہ فلاں حکمران نے اپنے تمام فرزندوں کو اس لیے تیغ کے گھاٹ اُتار دیا کہ آئندہ بغاوت کا اندیشہ نہ رہے۔

اگرچہ یہ اموات غمگین کنندہ اور افسوس کا باعث ہوتی ہیں لیکن انہیں مقتول کے لیے کسی قسم کا امتیاز یا افتخار نہیں سمجھا جاتا باوجودیکہ اس طرح کی موت میں مقتول بے گناہ اور بے خبر ہوتا ہے دوسری طرف دنیا قاتل کو نفرت اور غصہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے جس نے صرف اپنے فائدہ اور حسد و عداوت کی بنا پر ایک بے گناہ کو تہ تیغ کیا۔

۴۔ موت کی چوتھی قسم قتلِ خود یا خودکشی ہے۔ خودکشی مفت جان کھونے کا نام ہے۔ لوگ اس کو ملامت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ عمل گناہ سمجھا جاتا ہے۔ ٹریفک کے حادثہ میں جو لوگ اپنی غلطی کی وجہ سے مارے جاتے ہیں خودکشی کی فہرست میں شمار کیے جاتے ہیں۔

۵۔ موت کی پانچویں قسم "شہادت" ہے جس میں انسان تمام خطراتِ زندگی کو جانتے ہوئے مقصد اور ہدف کو بچانے کی خاطر راہ خُدا میں اپنی جان فدا کرتا ہے اور درجہ شہادت پر فائز ہوتا ہے۔

شہادت کے دو پہلو ہیں یعنی اوّل شہید مقصد اور ہدف کو بچانے کے لیے خُدا کی راہ میں، صرف خُدا کے لیے اپنی جان کو فدا کرے، دوسرے شہید کو اس کا علم ہو کہ وہ اس عمل میں اپنی جان کھو بیٹھے گا۔ (بعض اوقات قاتل کسی شخص کو اس کے عمل خیر سے روکنے کے لیے جو خُدا کی راہ میں فی سبیل اللہ مقتول ہو وصوکر سے اپنا نشانہ بناتا ہے۔ اگرچہ کہ مقتول یہاں بے خبر ہوتا ہے لیکن یہ عمل شہادت ہے اور قابل احترام بھی ہے)

شہادت میں چونکہ شہید اچھی طرح سے جانتا ہے کہ خُدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے اپنی جان کو مقصد اور ہدف کے لیے قربان کر دے گا اس لیے شہادت کو ایک عمل شجاعانہ اور مردانہ تصوّر

کیا جاتا ہے اور ایسی اموات زندگی سے بہتر اور محترم و مقدس سمجھی جاتی ہیں۔

اس مقام پر بہت ہی افسوس کے ساتھ اس مطلب کو بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اکثر ذاکرین سید الشہدا علیہ السلام جنھیں ان مسائل کی زیادہ خبر نہیں باوجودیکہ آنحضرت کو شہید کے مقدس نام سے یاد کرتے اور انہیں سید الشہدا کہتے ہیں۔ لیکن بے علمی کی وجہ سے شہادت سید الشہدا کو ایک قتل بے گناہ بتلاتے ہیں یعنی معاذ اللہ امام حسینؑ کی زندگی مفت ایک پلید کے ہاتھوں تمام ہوئی اسی طرح بہت سے عزادارن حسینی صرف امام کی مظلومی و بیچارگی اور بے دخالتی پر گریہ کرتے ہیں یعنی انہیں صرف اس کا افسوس ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت ایک چھوٹے معصوم بچے کے قتل کے مانند تھی جسے قاتل نے اپنی ہوس اور حسادت کی خاطر مار ڈالا۔

اگر شہادت سید الشہدا فقط قتل بے گناہ ہو جس میں امام حسینؑ کی کوئی بھی دخالت نہ ہو تو یہ فقط قتل بے گناہ ہے لیکن شہادت نہیں، تو پھر کس طرح سے امام حسینؑ سید الشہدا کہلائے جا سکتے ہیں۔ (قربانی امام حسینؑ محض جاہ طلبی اور ایک ملعون کی ہوس تھی) ہمیں کوئی شک نہیں کہ قاتلان امام مظلوم ظالم، جاہ طلب حریص اور ستمگار تھے، لیکن جس مقصد کے لیے انھوں نے حسینؑ کو اپنا نشانہ بنایا وہ امام حسینؑ کے مقصد کی پائیداری اور اسلام کی پاسداری تھی۔ وہ حسینؑ سے بیعت چاہتے تھے لیکن حسینؑ نے تمام عواقب کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی نہ فقط اس مطالبہ کو قبول نہیں کیا بلکہ اس پر اعتراض کیا اور خاموشی کو گناہ عظیم سمجھتے ہوئے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تاریخ کا دامن امام کے خطبوں سے بھرپور اور امام کی شجاعت کا گواہ ہے۔

تو معلوم ہوا کہ شہادت ایک بلند و باوقار درجہ ہے، جسے شہید آگاہانہ طور پر مقصد کو بچانے کی خاطر تمام زندگی و ہستی کو مٹا کر حاصل کرتا ہے۔

جہاد

دین اسلام خدا کی راہ میں اس کی خوشنودی کے لیے جنگ کرنے کے عمل کو جہاد کے نام

سے موسوم کرتا ہے موقعیت اور وقت کا لحاظ کرتے ہوئے ہم یہاں جہاد کے مسائل اور اس کے احکامات کے بارے میں زیادہ بحث نہیں کرسکتے کہ آیا جہاد میں حملہ کیا جاتا ہے یا صرف دفاع۔ اگر جہاد دفاع کا نام ہو تو دفاع شخصی اور قومی مدّنظر رکھا جائے یا اجتماعی؟ تاکہ آزادی و عدالت بشر جز دفاع اجتماعی نہیں۔ توحید جز آزادی و عدالت بشر ہے یا نہیں اور بنیادی طور پر جہاد حق آزادی کے منافی ہے یا نہیں۔

بہر حال یہ تمام بحثیں جالب اور مفید ہیں لیکن جہاد کی کتاب میں بیان کی جانی چاہئیں فعلاً یہاں یہی بتلانا چاہتا ہوں کہ اسلام ایسا مذہب نہیں کہ جس شخص نے ایک طمانچہ کھایا ہو اس کو دوسرا رخسار پیش کرنے کا حکم دے اور نہ ایسا دین ہے جو کہے کہ خدا کا کام خدا کرے اور شاہ کا کام شاہ یعنی خود کو ایک عضو معطل کی طرح الگ تھلگ رکھے، مسائل اسلام راز و نیاز اجتماع سے بھر پور ہیں اور اسلام نے دفاع کی کوشش کو لازم قرار دیا ہے۔

قرآن کریم میں کئی آیات تین مفاہیم مقدسہ "ایمان" "ہجرت" اور "جہاد" کی تعریف میں نازل ہوئی ہیں، قرآن کی روشنی میں انسان واقعی ایمان سے سرشار ہو اور ایمان کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کرے چنانچہ یہی انسان باایمان اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے اور بچانے کے لیے ہجرت کرتا ہے اور اجتماع کے ایمان کی حفاظت اور اس کے بچانے کے لیے جہاد کرتا ہے۔ وقت یہاں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ آیات قرآن و روایات جو اس ذیل میں ارشاد ہوئی ہیں بیان کروں، لیکن نہج البلاغہ سے چند جملے اس امر کو روشن کرنے کے لیے کافی سمجھتا ہوں۔ حضرت علی فرماتے ہیں:۔ اِنَّ الْجِهَادَ بَابٌ مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَتَحَهُ اللّٰهُ لِخَاصَّةِ أَوْلِيَائِهِ

جہاد ایک ایسا دروازہ جنت ہے جس کو خداوند عالم نے ہر شخص کے لیے نہیں کھولا۔ یعنی ہر شخص اُس مقام و منزلت تک نہیں پہنچ سکتا کہ خدا اُس پر جہاد کا دروازہ کھولے، یا ہر شخص کی قسمت نہیں کہ وہ "مجاہد" بنے۔ خداوند عالم اپنے لطف و کرم سے یہ عنایت مخصوص دوستوں کو عطا کرتا ہے۔ مجاہد کی منزلت " اولیا اللہ سے اونچی ہے مجاہد کا شمار

"خاصة اولیاءاللہ" یعنی خاص دوستانِ خدا کی صف میں کیا جاتا ہے۔

قرآن فرماتا ہے جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ لیکن جنت کو ان آٹھ دروازوں کی کیا ضرورت؟ آیا یہ دروازے خدا نے اس لیے بنائے ہیں کہ روزِ محشر جنت میں داخلہ کے لیے ہجوم نہ ہو، لیکن خدا کو اس چیز کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ خدا فرماتا ہے وَھُوَسَرِیْعُ الْحِسَاب یعنی اللہ ایک لحظہ کے اندر اندر تمام بندوں کے حساب کو مکمل کرے گا۔ جنت کے دروازہ پر ہجوم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور نہ وہاں صف بندی کا مسئلہ پیش ہوگا۔

تو کیا خدا نے ان دروازوں کو تعارف کی خاطر بنا رکھا ہے کہ امراء اور فضلاء ایک دروازے سے اور غریب غرباء و مساکین دوسرے دروازے سے جنت میں داخل ہوں، لیکن ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہ درجہ بندی وہاں نہیں، پھر شاید لوگوں کے مشاغل کے تحت آٹھ دروازوں کی ضرورت پیش آئی ہوگی یعنی اُستاد و معلم ایک دروازے سے، تاجر دوسرے مزدور و فقیر تیسرے دروازے سے جنت میں داخل ہوں، لیکن یہ ایک امر مسلّم ہے کہ خدا بجز تقویٰ اور ایمان بندوں میں فرق ہی نہیں کرتا چنانچہ یہ سب مطالب غلط ہوئے۔ خدا کے نزدیک درجات کی اہمیت ہے۔ یہ درجات انسان دنیا میں اپنے عمل و ایمان اور تقویٰ کی بدولت حاصل کرتا ہے جس کسی نے اپنے ایمان و عمل و تقویٰ کو زیادہ کیا اس کا درجہ بھی اُسی قدر عالی ہوگا اور اُسی نسبت سے اُس پہ جنت کے دروازے کھولے جائیں گے، چنانچہ جس دروازے سے مجاہدین اور شہداء جنت میں داخل ہوں گے وہ دروازہ مخصوص دوستانِ خدا کے لیے بنایا گیا ہے۔

ایک اور مقام پر حضرت علیؑ فرماتے ہیں:- وَھُوَلِبَاسُ التَّقْوٰی جہاد تقویٰ کا لباس ہے۔ تقویٰ روح اور اخلاق کی پاکیزگی، خود ستائی اور خود غرضی سے دُور رہنے کا نام ہے۔ مجاہد واقعی تقویٰ کی منازل میں عام متقیوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ کوئی شخص متقی ہو اس لیے کہ وہ حسد نہیں کرتا دوسرا غرور سے پاک ہے تیسرا حرص سے اور

چوتھا بخل وغیرہ سے لیکن مجاہد ان سب سے پاکیزہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی زندگی کی بازی لگا دی ہے چنانچہ اسی لیے جنّت کے دروازے جو مجاہدین پر کھولے جاتے ہیں تمام متقیوں سے الگ ہیں۔

آیا تقویٰ اور متقین خداوند عالم کے نزدیک درجات اور مراتب کے حامل ہیں؟ قرآن کی روشنی میں معلوم کیسے جا سکتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوا وَّآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوا وَّآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوا وَّأَحْسَنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ :

جنھوں نے ایمان لایا اور عمل صالح انجام دیئے اور نعمت دُنیا کو استعمال کیا وہ ان کا حق ہے ہمیشہ تقویٰ و ایمان و عمل صالح کو اپنے نزدیک رکھیں اور بعد اس کے ایمان اور تقویٰ اور پھر تقویٰ اور احسان پر کاربند رہیں اللہ محسنین کو پسند کرتا ہے۔

اس آیت قرآن نے دو مسائل کو واضح کیا ہے۔ پہلے جس پر کہ ہم بحث کر چکے ہیں ایمان اور تقویٰ درجات اور مراتب کے حامل ہیں۔ دوسرے انسان کی زندگی کا مقصد اور انسان کا حق کیا ہے۔

خُدا فرماتا ہے کہ ہم نے نعمتیں انسان کے لیے پیدا کی ہیں اور انسان کو ایمان اور تقویٰ اور عمل نیک کے لیے خلق کیا ہے۔ یعنی انسان صرف اُس وقت نعمات خُدا کو استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے جبکہ وہ ایمان و تقویٰ و عمل صالح کی راہ پر گامزن ہو۔

علماء اسلام نے آیات قرآنی، روایات اور ارشادات اسلامی کو پیش نظر رکھتے ہوئے تقویٰ کی درجہ بندی کی ہے تقویٰ عام، تقویٰ خاص اور تقویٰ خاص الخاص۔

مجاہدین کا تقویٰ، تقویٰ خاص الخاص ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے اپنے تمام اختیارات کو سبدِ اخلاص میں سجا کر بارگاہ حق میں پیش کر دیا ہے دوسرے مقام پر حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

وَ دِرْعُ اللّٰهِ الْحَصِيْنَةُ وَ جُنَّتُهُ الْوَثِيْقَةُ

جہاد خدا کی دی ہوئی ایسی زرہ ہے جسے کوئی قدرت پھاڑ نہیں سکتی اور خدا کی دی ہوئی ایسی ڈھال ہے جسے کوئی طاقت کاٹ نہیں سکتی۔ سچ ہے اگر ملت مسلمان جس کی روح جہاد کی مشتاق ہو، خدا کی دی ہوئی زرہ کو پہن کر، خدا کی دی ہوئی ڈھال ہاتھ میں تھام لے تو کوئی بھی دُنیا کا حملہ انھیں شکست نہیں دے سکتا۔ زرہ اُس لوہے کے لباس کو کہتے ہیں جسے ایک سپاہی جنگ کے وقت پہنتا ہے اور ڈھال اُس شئے کو کہتے ہیں جسے سپاہی اپنے ہاتھ میں تھام کر دُشمن کے حملہ کو روکتا ہے، زرہ کا کام جسم کی حفاظت کرنا ہے جبکہ ڈھال کا کام حملہ کو روکنا ہے۔ شاید اسی لیے حضرت علیؑ نے جہاد کو زرہ اور ڈھال سے تعبیر کیا ہے کیونکہ بعض جہاد اجتماع کی حفاظت اور بعض دشمن کے حملوں کو بے اثر کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔

حضرت علی ان لوگوں کی مذمت میں جنھوں نے جہاد سے راہِ فرار اختیار کی ہے فرماتے ہیں۔

مَنْ تَرَكَهُ رَغْبَةً عَنْهُ أَلْبَسَهُ اللّٰهُ لِبَاسَ الذُّلِّ - وَشَمِلَهُ الْبَلَاءُ وَدُيِّثَ بِالصَّغَارِ وَالْقَمَاءِ وَضُرِبَ عَلَىٰ قَلْبِهِ بِالْأَسْدَادِ وَأُدِيْلَ الْحَقُّ مِنْهُ بِالتَّضْيِيْعِ الْجِهَادِ وَسِيْمَ الْخَسْفَ وَمُنِعَ النَّصَفَ ۔

جن افراد نے بغیر کسی خاص دلیل کے جہاد سے منہ موڑ لیا ہے خدا انھیں ذلت اور ملامت کا لباس پہنواتا ہے اور انھیں حقارت کی گہرائیوں میں پھینک دیتا ہے اور ان کے قلب کی روشنی پر تاریک پردے ڈال دیتا ہے اور ان سے اونچا و عالی سوچنے کی فکر کو لے لیتا ہے۔ حکومت ان کو دیئے ہوئے امتیازات اور عنوانات واپس لے لیتی ہے اور آخر کار سخت مصیبتوں اور مشقتوں میں پھنس جاتے ہیں اور کوئی قدرت ان کے حق کی بابت انصاف بھی روا نہیں رکھتی۔

اس مقام پر حضرت علیؑ نے جہاد سے دوری کرنے کے نقصانات کو بتلایا ہے جو ایک

یا دو افراد کے لیے نہیں بلکہ اس جملہ سے صاف واضح ہے کہ یہ مسائل اجتماع و معاشرہ کے فوائد کے لیے کیے گئے ہیں۔ جہاد سے فرار کے نقصانات کا اس طرح خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جو ملّت جہاد سے منہ موڑ لیتی ہے وہ دُنیا کی نظر میں ذلیل اور خوار رہتی ہے۔

۲۔ جو افراد جہاد سے دوری کر کے سمجھتے ہیں کہ آسائش کی زندگی بسر کریں گے، حقیقت میں وہ ذلّت اور عذاب کی زندگی میں مبتلا ہوں گے۔

۳۔ ان افراد کی روح ہمیشہ میّت اور حقیر رہے گی۔

۴۔ مکتب اسلام قلب کی روشنی اور عالی سوچ کی کیفیت کو عمل خالص کی دین سمجھتا ہے چنانچہ اسی لیے جہاد اجتماع کے لیے ایک حکم عمل ہے اور اگر کوئی اس عمل کو انجام نہ دے تو حضرت علیؑ کے ارشاد کے مطابق قلب کی روشنی اور اونچا سوچنے کی کیفیت کو کھو بیٹھتا ہے۔

۵۔ جنھوں نے جہاد سے راہِ فرار اختیار کیا ہو انھیں پرچمدارِ اسلام یا منادی اسلام کہنے کا حق ہی نہیں ہوتا اور یہ حق ان سے واپس لے لیا جاتا ہے۔

۶۔ جن افراد نے جہاد کو ترک کیا ہے وہ دوسروں سے اپنا حق بھی حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ جب تک ایک ملت مجاہد ہو، دوسری اقوام اس کا احترام کرتی ہیں اور اس کا حق دینے کے لیے مجبور ہوتی ہے، لیکن اگر کسی ملّت نے اس خاصیت کو کھو دیا ہو تو پھر دوسری ملتیں نہ تو ان کے احترام کی قائل ہوتی ہیں اور نہ انکے بارے میں انصاف کرتی ہیں بہرحال یہ تمام مصیبتیں اور ذلتیں جہاد سے کنارہ کشی کا نتیجہ ہیں۔

شاید اسی لیے رسُولِ اکرمؐ نے فرمایا: أَلْخَيْرُ كُلُّهُ فِي السَّيْفِ وَتَحْتَ ظِلِّ السَّيْفِ: خیر اور برکت تلوار اور اس کے سایہ میں ہے پھر فرماتے ہیں: إِنَّ اللهَ أَعَزَّ أُمَّتِي بِسَنَابِكِ خَيْلِهَا وَمَرَاكِزِ رِمَاحِهَا۔

خداوندِ عالم نے میری امت کو گھوڑوں کی ٹاپوں اور نیزوں کی بدولت عزیز رکھا۔ یعنی

امتِ محمدیؐ امت مقصد اور ہدف ہے اور دین اسلام دین قدرت اور مجاہد معاذ۔

ویل دورانت اپنی کتاب تاریخ اور تمدن میں "لکھتا" ہے۔ کسی بھی دین نے اسلام کی طرح اپنے پیروؤں کو قدرت اور طاقت کی طرف نہیں پکارا۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہوتا ہے کہ مَنْ لَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ نَفْسَہٗ بِغَزْوٍ مَاتَ عَلٰی شُعْبَۃٍ مِنَ النِّفَاقِ جس نے جہاد نہ کیا ہو اور آرزو جہاد بھی اس کے دل تک نہ پہنچی ہو تو وہ حسرت میں مرے گا۔ گویا اس کے دل میں نفاق کا کوئی ذرہ ہے یعنی اسلام انسان کو جہاد یا کم از کم آرزو جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔

کسی نے پیغمبرؐ اکرم سے سوال کیا مَا بَالُ الشَّہِیْدِ لَا یُفْتَنُ فِیْ قَبْرِہٖ شہید سے قبر میں کیوں سوال و جواب نہیں کیا جاتا ہے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کَفٰی بِالْبَارِقَۃِ فَوْقَ رَاْسِہٖ فِتْنَۃً شہید نے جس وقت تلوار کی دھار اس کے سر کو کاٹ رہی تھی امتحان کی منزل میں تمام جوابات کو ادا کیا یعنی شہید نے اپنی صداقت اور وعدہ وفائی کو ظاہر کر دیا اور اسی لیے عالم قبر و برزخ میں اس کے لیے کوئی سوال و جواب کا موقع باقی ہی نہیں رہا۔

شوقِ شہادت

پیغمبرؐ اکرم کے دورِ حیات میں ایک خاص قسم کا جذبہ اہلبیت اصحاب اور انصار میں دیکھا جاتا تھا جس کو جذبہ شوق شہادت کہا جا سکتا ہے، جس میں حضرت علیؑ کی شخصیت ہمیشہ پیش پیش نظر آتی ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ

تو میں جان گیا کہ جب تک رسولؐ خدا ہمارے درمیان ہیں کوئی فتنہ نازل نہ ہوگا۔ میں نے رسولؐ خدا سے سوال کیا کہ یہ فتنہ کیا فتنہ ہے، پیغمبرؐ نے فرمایا یا علیؑ میری زندگی کے بعد امت اس فتنہ سے دوچار ہوگی۔ میں نے کہا یا رسول اللہ جنگ احد میں جب دوسرے مسلمین شہادت

کے درجہ پر فائز ہوئے اور میں شہادت سے محروم رہا، تب آپؐ نے مجھے ایک خوشخبری دی تھی اور فرمایا تھا کہ تیری شہادت آیندہ ہوگی۔ پیغمبرؐ نے فرمایا ہاں میں نے ٹھیک کہا ہے اور تمہاری شہادت آگے آئے گی پھر پیغمبرؐ نے فرمایا۔ اچھا علیؑ بتلاؤ شہادت کے وقت کیونکہ صبر کرو گے تو میں نے عرض کیا۔ یارسولؐ اللہ وہ صبر کا مقام نہیں بلکہ شکر گزاری کا وقت ہوگا۔

اسے کہتے ہیں جذبہ شوق شہادت۔ علیؑ شہادت کی اُمید میں زندگی گزار رہے تھے اگر یہ اُمید علیؑ کی زندگی سے نکال لی جاتی تو علی کی زندگی میں رونق ہی باقی نہ رہتی اور زندگی علیؑ کے لیئے ایک بے معنی چیز بنکر رہ جاتی۔

ہم لوگ زبان سے تو بہت علیؑ علیؑ کرتے ہیں اور شاید عمل کیئے بغیر زبان سے علی کی مدح کرنے میں ہم سے شیعہ تر دنیا میں کوئی نہ ہوگا، لیکن حقیقی شیعیت (انشاءاللہ آپ سب لوگ شیعہ ہوں گے) علیؑ کے ساتھ علیؑ کی راہ پر چلنے کا نام ہے جو بہت مشکل کام ہے اور جہاد اس کا صرف ایک نمونہ ہے۔

حضرت علیؑ کی شخصیت کو چھوڑیں، دوسرے اشخاص کو دیکھیں جن کے دل اس جذبہ شوقِ شہادت سے لبریز نظر آتے ہیں۔ ان کے دلوں میں صرف ایک ہی آرزو تھی اور وہ شہادت تھی۔ آئمہ اطہار کی دعائیں جو ہم تک پہنچی ہیں فرماتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ بِرَحْمَتِکَ فِی الصَّالِحِیْنَ فَاَدْخِلْنَا، وَفِی عِلِّیِّیْنَ فَارْفَعْنَا وَقَتْلًا فِی سَبِیْلِکَ مَعَ وَلِیِّکَ فَوَفِّقْ لَنَا

اے اللہ اپنی رحمت کے تصدق ہمیں صالحین میں داخل فرما اور علیین کا مقام عطا فرما اور ہم کو توفیق عطا فرما کہ ہم تیرے دوست کے ساتھ تیری راہ میں شہید ہوں اور ہمیں شہادت کا درجہ حاصل ہو اس شوقِ شہادت کو ہم جوانوں میں، بوڑھوں میں، سفیدوں میں، سیاہوں میں، بہر حال تمام مومنوں میں دیکھتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ پیغمبرؐ اکرم کی خدمت میں آکر التماس کرتے تھے کہ یارسولؐ اللہ دعا کیجیے کہ ہم خدا کی راہ میں شہید ہوں اور خدا ہمیں درجہ شہادت سے سرفراز فرمائے۔

کتاب "سفینۃ البحار" میں ایک شخص بنام خثیمہ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ باپ اور بیٹے میں

شہادت پر فائز ہونے کے لیئے کیونکہ بحث و جھگڑا ہوا۔ راوی لکھتا ہے جب جنگِ بدر پیش آئی تو اس شخص اور اس کے بیٹے میں بحث شروع ہوئی کہ کون جنگ پر جائے اور کون گھر کی دیکھ بھال کرے۔ باپ نے بیٹے سے کہا کہ میں جنگ پر جاؤں گا اور تو گھر کی دیکھ بھال کر، بیٹے نے جواب دیا۔ نہیں۔ تو گھر میں بیٹھ اور میں جنگ پر جاؤں گا۔ جب اس بحث و مباحثہ سے نتیجہ نہ نکلا، تو اُنھوں نے قرعہ کشی کی اور قرعہ میں پسر کا نام نکلا، چنانچہ وہ جنگ میں لڑ کر شہید ہو گیا۔

کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ باپ نے اپنے جوان بیٹے کو خواب میں دیکھا کہ بہت خوش ہے اور درجاتِ عالیہ اس کو عطا کیے گئے ہیں۔ بیٹے نے باپ سے کہا

خُدا نے جو وعدہ ہم سے کیا تھا وہ سچا اور درست تھا اور خُدا نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا ہے دوسرے دن وہ شخص رسول خُدا کی خدمت میں حاضر ہوا اور خواب کو بیان کر کے کہنے لگا یا رسول اللہ اگرچہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری ہڈیاں کمزور اور سست ہو گئی ہیں لیکن مجھے شہادت کی بہت آرزو ہے۔ دعا کیجئے کہ خُدا مجھے شہادت کا شرف عطا فرمائے۔ پیغمبر اسلام نے دعا فرمائی کہ خداوند عالم اس بندہ مومن کو شہادت سے سرفراز فرما۔ چنانچہ ایک سال کا عرصہ نہ ہوا تھا کہ جنگ اُحد بپا ہوئی اور یہ شخص شہید ہوا۔

دوسرا واقعہ ایک شخص بنام عمرو بن جموح کا ہے ایک پیر سے معذور ہونے کی وجہ سے جہاد کا حکم اس پر جاری نہیں ہوتا تھا۔ جب جنگ اُحد پیش آئی تو یہ شخص اپنے بیٹوں کے ساتھ جنگ کو جانے کی تیاری کرنے لگا، بیٹوں نے منع کیا لیکن اس نے نہ سُنی قبیلہ کے بڑے لوگوں کو جمع کیا گیا اُنھوں نے بھی منع کیا لیکن اس نے سب کی بات رد کر دی، بالآخر یہ افراد پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تب اُس شخص نے کہا! یا رسول اللہؐ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میرے بچے مجھ کو شہید ہونے سے منع کریں، اگر شہادت ایک خوب چیز ہے تو میرے لیئے بھی خوب ہوگی، میری تنہا آرزو یہی ہے کہ میں خُدا کی راہ میں شہید ہوں۔ رسول خُدا نے اس کے بیٹوں

سے فرمایا کہ اس شخص کے راستہ میں رکاوٹ پیدا نہ کریں کیونکہ اس کی آرزو شہادت ہے اگرچہ جہاد اس پر واجب نہیں لیکن حرام بھی نہیں ہے۔ تو وہ شخص خوشحال ہوگیا اور مسلح ہوکر میدانِ جنگ میں آیا اور لڑتا ہوا قلب لشکر تک جا پہنچا اور آخر کار شہید ہوگیا۔ جب مسلمانوں کی شکست کی خبر مدینہ پہنچی تو وہاں کی عورتیں اور مرد مدد کے لیے اُحد پہنچے جن میں عمرو بن جموح کی بیوی بھی شامل تھی۔ اس عورت نے اپنے شوہر بیٹے اور بھائی کے جنازوں کو ایک اونٹ پر رکھا اور بقیع میں دفن کرنے کے لیے مدینہ کا رُخ کیا لیکن متوجہ ہوئی کہ اونٹ مشکل سے ایک ایک قدم بڑھا رہا ہے، راستہ میں عائشہ کو دیکھا اور کہا کہ میرے اونٹ کی داستان عجب ہے جب اسکو مدینہ کی طرف کھینچتی ہوں تو مشکل سے قدم بڑھاتا ہے لیکن جب اُحد کی طرف موڑتی ہوں تو بہت تیز تیز حرکت کرتا ہے۔ عائشہ نے کہا اس کا حال رسول خدا سے پوچھیں چنانچہ یہ بیوہ عائشہ کے ہمراہ رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور داستان کو بیان کیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا۔ آیا تیرے شوہر نے گھر سے نکلتے وقت کوئی دعا نہیں کی تھی۔ اُس بیوہ نے کہا، جب وہ گھر سے باہر نکلا تھا تو اپنے دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے کہنے لگا تھا۔ خدایا مجھ کو گھر واپس نہ لانا۔ رسولؐ خدا نے فرمایا خدا نے تیرے شوہر کی دعا کو مستجاب کیا اور اس کو شہادت کے درجہ سے سرفراز فرمایا۔ جنازہ کو یہاں چھوڑ جا، تاکہ دیگر شہدا کے ساتھ احد میں دفن کریں۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں لَاَلْفُ ضَرْبَۃٍ بِالسَّیْفِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ مِیْتَۃٍ عَلٰی فِرَاشٍ اگر تلوار کے ہزار وار سے میری پیشانی اور سر کو کاٹا جائے تو میرے لیے یہ شہادت اُس موت سے بہتر ہے جو کسی بیماری کے باعث بستر پر واقع ہو۔

امام حسینؑ کربلا کے راستہ میں حضرت علیؑ کے فرمائے ہوئے اشعار پڑھتے رہتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

فان تکن الدنیا تعد نفیسۃ — فدار ثواب اللہ اعلی وانبل

وان تکن الاموال للترک جمعھا — فما بال متروک بہ المرء یبخل

وان تکن الابدان للموت انشات — فقتل امرء بالسیف فی اللہ اجمل

اگرچہ کہ دنیا زیبا اور دلکش ہے جو انسان کو اپنی طرف کھینچی ہے لیکن خدا کی بتلائی ہوئی آخرت دنیا سے زیادہ خوبصورت اور بلند و عالی ہے۔

جب مال دنیا کو چھوڑ جانا ہو تو کیوں انسان اس مال کو خدا کی راہ میں خرچ نہ کرے۔ اگر ہمارے جسم اس لیئے بنائے گئے ہوں کہ ایک دن مر جائیں تو خدا کی راہ میں کیوں تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوں جو (موت سب سے) بہتر ہے۔

شہید کی منطق

ہر شخص اور ہر گروہ اپنے لیئے ایک خاص طرز فکر کا حامل ہے اور اسی فکر کی بنا پر وہ اپنے لیئے حدود اور معیار مقرر کرتا ہے اور چنانچہ انہی حدود اور معیار کی روشنی میں وہ اپنے انجام دیئے ہوئے افعال و اعمال کی جانچ اور ان کی قدر و منزلت سے آگاہ ہوتا ہے۔

شہید کی طرز فکر یا شہید کی منطق کو عام لوگوں کی منطق سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ شہید کی طرز فکر کا مقام بلند اور خاص خصوصیت کا حامل ہے۔ شہید کی منطق ایک طرف عشق خداوندی سے بھرپور اور دوسری طرف معاشرہ کی خدمت اور اصلاح کے لیئے آمادہ ہوتی ہے۔

شہید کی طرز فکر کو وجود میں لانے کے لیے ہمیں دو قسم کے افکار کو یکجا کرنا پڑے گا یعنی ایک رہنما کی طرز فکر جو اجتماع اور عوام کی خدمت کے لیئے ہو اور ایک زاہد کی طرز فکر جو صرف عشق خداوند عالم سے سرشار ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں جب امام حسینؑ نے کوفہ کا رُخ کیا تو اُس دور کے عقلمندوں اور سیاستدانوں نے امام کو اس سفر سے منع کیا۔ ان کی نظر میں امام حسینؑ کا یہ کام منطقی نہ تھا اور ان کے لحاظ سے حقیقت بھی یہی تھی کیونکہ ان لوگوں کی طرز فکر یا ان کی منطق ایک عام انسان کی منطق تھی جو صرف اپنے مفاد اور حفاظت پر مشتمل تھی۔ ان کی منطق سیاسی تھی اور اس کی روشنی میں امام کا یہ امر منطقی نہ تھا لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ امام حسینؑ کی منطق ایک شہید کی منطق تھی اور شہید کی منطق عوام کی منطق سے عالی ہوتی ہے۔

عبداللہ ابن عباس اور محمد ابن حنفیہؒ معمولی انسان نہ تھے بلکہ ان کا شمار اُس دور کے بڑے سیاستدانوں اور روشن فکروں میں کیا جاتا تھا، چنانچہ ان کی طرزِ فکر کے مطابق (جو صرف حفاظت مفاد اور شکستِ دشمن پر مشتمل تھی) امام حسینؑ کا کوفہ کی طرف سفر کرنا عقلمندی کا کام تصور نہیں کیا جاتا تھا چنانچہ اسی لیئے ابن عباس نے امام کو مشورہ دیا کہ کوفہ کی عوام کو خط لکھیں کہ اگر حقیقت میں حسینؑ ابن علی کے طرف دار ہیں تو یزیدی امراء اور منصب داروں کو کوفہ سے باہر نکال دیں اور کوفہ میں امن و امان قائم کریں۔ چنانچہ اگر کوفہ کے لوگوں نے یہ کام کیا تو آپ ضرور تشریف لے جائیں اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں تھام لیں اور اگر اُنھوں نے اس کام کو انجام نہ دیا تو پھر کوفہ کا رخ نہ کریں۔

امامؑ نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا میں ضرور جاؤں گا تو ابن عباس نے کہا۔ آپ شہید کر دیئے جائیں گے امام نے جواب دیا، شہادت میری میراث ہے۔ ابن عباس نے سوال کیا تو پھر شہید اپنے اہل وعیال کو تو ساتھ نہیں بھجایا کرتا امامؑ نے فرمایا اہل وعیال کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔

سچ ہے کہ شہید کی طرزِ فکر، شہید کی منطق، عام انسانوں کی فکروں سے جدا ہوتی ہے شہید کی فکر اپنے آپ کو فنا کر کے بزمِ انسانیت کو روشن کرنا ہے، اس کی فکر اپنے آپ کو مٹا کر کے اجتماع کی رگوں میں جوش لانا ہے۔ اُس کی فکر اپنی روح کو بدن سے آزاد کر کے انسانیت کے پژمردہ بدن میں روح پھونکنا اور اس کو زندہ کرنا ہے۔ اس کی فکر، آیندہ نسلوں کی رہنمائی اور انکو راہ راست پر لانا ہے۔

اسی لیئے لفظ شہید ایک لفظ نورانی ہے۔ جس کے اطراف میں نور کی شعاعیں طواف کرتی رہتی ہیں، یہ لفظ دوسرے الفاظ کی نسبت مقدس اور عظیم ہے اور کوئی بھی لفظ اس لفظ کے مقام و مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

شہید کا خُون

شہید کیا کرتا ہے، شہید کا کام صرف یہی نہیں کہ دُشمن کے مقابل کھڑے ہو کر دشمن کو واصل جہنم کرے یا خود کو دُشمن کی تلوار کی نذر کرے۔ اگر شہید فقط یہی کام کرے تو جس وقت دُشمن کی تلوار شہید کے خون کو زمین پر بہائے تو کہہ سکتے ہیں کہ شہید کا خون رائیگان بہہ گیا۔ لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔

کسی بھی وقت شہیدوں کا خون رائیگاں اور ضائع نہیں ہوتا۔ شہید کا خون زمین میں جذب نہیں ہوتا، بلکہ اس کا ہر ہر قطرہ، ہزاروں بلکہ لاکھوں قطروں میں تبدیل ہو کر، ایک دریا کی شکل اختیار کر کے معاشرے کے بدن میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا۔ کوئی بھی قطرہ خدا کے نزدیک اُس قطرہ خون کی نسبت جو راہ خدا میں بہایا جائے بہتر اور قابل مقایسہ نہیں۔ شہادت معاشرے کے نحیف بدن کو خون دینے کا نام ہے۔ یہ شہدا ہیں جو معاشرے کی سوکھی رگوں کی اپنے خون سے آبیاری کرتے ہیں۔

شہید کی کارنامہ سازی

شہید کارنامہ ساز ہوتا ہے شہید کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی کارنامہ سازی اور شجاعت ہوتی ہے۔ جن اقوام کی روح، خدا کی راہ میں شجاعت دکھلانے اور کارنامہ سازی کرنے میں پژمردہ ہو جاتی ہے، شہید اپنی شہادت کے ذریعہ ان میں جان ڈالتا ہے لہذا دین اسلام ہمیشہ شہید کا محتاج ہے کیونکہ ہمیشہ کارنامہ سازی اور شجاعت کی ضرورت رکھتا ہے۔

شہید زندہ جاوید ہوتا ہے

ایک عالم اپنے علم کی بدولت سوسائٹی کی خدمت کر کے معاشرے سے منسلک ہوتا ہے،

چنانچہ اجتماع (معاشرہ) عالم کو اس کے علم کی بدولت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یعنی عالم اپنی شخصیت کے صرف ایک پہلو یعنی اپنی فکر و اندیشہ کی بدولت اجتماع (سوسائٹی) کی خدمت کر کے اپنی شخصیت کو زندہ جاوید کرتا ہے۔

مُوجد اپنی ایجاد کی بدولت سوسائٹی کی خدمت کرتا ہے اور اجتماع سے منسلک ہوتا ہے، یعنی وہ اپنے فن و ہنر و صنعت کی بدولت اجتماع کی خدمت کرتا ہے اور اجتماع (معاشرہ) اس کے فن و ہنر کی وجہ اسے زندہ جاوید رکھتا ہے۔

ایک استادِ اخلاق، اپنے فلسفہ اخلاق کو سینہ بہ سینہ اپنے شاگردوں میں منتقل کر کے اجتماع میں اپنے نام کو زندہ جاوید کرتا ہے۔

لیکن شہید اپنے خون اور اپنے تمام وجود کی بدولت معاشرے میں اپنے آپ کو زندہ جاوید کرتا ہے۔ یعنی وہ اجتماع کی رگوں میں زندہ خون کو پیدا کرتا ہے۔

باالفاظ دیگر جو اپنی طرز فکر کو زندگی جاودانگی دیتا ہے وہ عالم یا فلسفی ہے، جو اپنے فن و ہنر و صنعت کو زندگی جاودانگی دیتا ہے وہ فنکار یا موجد ہے۔ جو اپنی حکمت عملی اور رہنمائی کے ذریعہ معاشرے کی خدمت کرتا ہے وہ رہبر یا اُستادِ اخلاق ہے لیکن شہید اپنے خون کو بلکہ حقیقت میں اپنے تمام وجود کو زندگی اور جاودانگی دیتا ہے۔ شہید کا خون ابدیت تک اجتماع کی رگوں میں جوش مارتا رہے گا۔

پس ہر شخصیت یا گروہ صرف اپنے ایک پہلو کو زندگی دیتا ہے، لیکن شہید اپنے تمام پہلوؤں اور اپنے تمام وجود کو زندگی بخشتا ہے۔ اسی لیئے پیغمبرؐ نے فرمایا۔

فَوْقَ كُلِّ ذِي بِرٍّ بِرٌّ حَتَّىٰ يُقْتَلَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَ إِذَا قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَلَيْسَ فَوْقَهُ بِرٌّ

ایک نیکی دوسری سے بڑھ کر اور دوسری، دوسری نیکی سے بڑھ کر موجود ہے، یہاں تک کہ آدمی خدا کی راہ میں شہید ہو جائے اور پھر شہادت سے بڑھ کر نیکی کا وجود ہی نہیں۔

شہید شافع ہوتا ہے

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا خداوند عالم قیامت کے دن تین گروہوں کی سفارش و شفاعت کو قبول کرے گا۔ ایک انبیاءؑ دوسرے آئمہ اطہار اور علماء جوان کے پیروؤں اور تیسرے شہدا۔ پس معلوم ہوا کہ انبیا و ائمہ اطہار و علماء حق کے بعد یہ شہدا ہیں جو روز قیامت شفاعت کریں گے جو کہ دنیا میں انبیاء ائمہؑ و علمائے حق کے بعد یہ شہدا ہی تھے جنھوں نے لوگوں کو ظلمت کی راہ سے نجات دی اور انھیں راہ حق کی ہدایت کی اور اسی راہ پر ہدایت کے چراغ روشن کیے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا۔ خداوند عالم شہید کو عظمت و جلال کے نور سے آراستہ کر کے میدان حشر میں لائے گا اور اگر انبیا کا ان کے سامنے سے گزر ہوگا تو انبیا ان کے احترام میں اپنی سواری سے اُتر جائیں گے۔ یہ ہے مقام و منزلت شہید۔

شہید پر رونے کی تاکید

پیغمبر اکرمؐ کے دوران زندگی میں جن لوگوں نے شہادت کا شرف حاصل کیا، ان میں سب سے قابل احترام جنھیں "سید الشہدا" کا لقب ملا حضرت حمزہ ابن عبد المطلب تھے، آپ پیغمبر کے چچا تھے اور جنگ اُحد میں شہید ہوئے۔

جن حضرات نے عتبات عالیہ کی زیارات کی ہیں یقیناً قبر جناب حمزہ کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے ہوں گے، حضرت حمزہ مدینہ میں تنہا زندگی بسر کرتے تھے چنانچہ جنگ کے خاتمہ پر جب پیغمبر اکرم مدینہ پہنچے تو دیکھا کہ حضرت حمزہ کے گھر کے سوا تمام شہیدوں کے گھر ماتم عزا بپا ہے۔ پیغمبر اسلام کو یہ بات ناگوار گزری اور آپؐ نے فرمایا: اما حمزۃ فلا بواکی لہ تمام شہیدوں پر تو رونے والے موجود ہیں لیکن حمزہ پر کوئی رونے والا نہیں ہے۔ اس جملے کا سُننا تھا کہ تمام اصحاب حضرت حمزہ کے گھر جمع ہوئے اور انھوں نے پیغمبر اکرم اور حضرت حمزہ

کے احترام میں صف ماتم عزا بچھائی اور گریہ کیا۔ اس واقعہ کے بعد مدینہ میں یہ رسم پڑ گئی کہ کوئی شہید پر رونا چاہتا تو پہلے حضرت حمزہ کے گھر جا کر صفِ ماتم بچھاتا پھر اپنے گھر مجلس عزا بپا کرتا۔

ان واقعات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام اگرچہ عام میت پر رونے کو پسند نہیں کرتا لیکن شہید پر رونے کی تاکید کرتا ہے کیونکہ شہید کارنامہ ساز اور عالی مرتبہ کا حامل ہوتا ہے۔ شہید پر گریہ، اس کے شجاعانہ کارنامہ میں شرکت کے برابر، اس کی روح کے ساتھ حرکت کا نام اس کے جذبۂ عمل پر راضی ہونے کا اقدام اور اس کی بتلائی ہوئی راہ پر گامزن ہونے کے مماثل ہے۔

واقعہ کربلا کے بعد شہادت امام حسینؑ نے تمام شہادتوں کو اپنی شہادت کی شعاعوں کے تحت لے لیا اور اسی لیے "سید الشہدا" کا لقب آپ کو ملا، اگرچہ حضرت حمزہ بھی "سید الشہدا" ہیں لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام "سید الشہدا مطلق ہیں۔ یعنی حضرت حمزہ ابن عبد المطلب اپنے زمانے کے سید الشہدا ہیں اور امام حسین علیہ السلام تمام زمانوں اور تمام ادوار کے سید الشہدا ہیں جس طرح حضرت مریم عذرا اپنے زمانے کی سیدۃ النساء تھیں لیکن حضرت فاطمۃ الزہرا تمام زمانوں کی "سیدۃ النساء" ہیں۔

امام حسینؑ کی شہادت سے پہلے جس شہید پر رونا سنّت تھا اور جس پر رونا اس کے شجاعانہ کارنامہ میں شرکت اور اس کی روح کے ساتھ حرکت اور اس کے جذبۂ عمل پر راضی ہونے کا نام تھا وہ شخصیت حضرت حمزہ تھے لیکن واقعہ کربلا کے بعد یہ مقام امام حسینؑ کے لیے مخصوص ہو گیا۔

شہید پر رونے کا فلسفہ

اس مقام پر میں شہید پر رونے کے فلسفہ کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

ہمارے اس دور میں، بہت سے لوگ خصوصاً ہمارے نوجوان امام حسینؑ پر رونے کو پسند نہیں کرتے اور سخت اعتراض کرتے ہیں چنانچہ چند بار مجھ پر بھی اس ضمن میں اعتراض کیا گیا ہے۔

بعض افراد اپنی تقاریر و مقالات میں واضح طور سے اس رونے کے عمل کو غلط بتلاتے ہیں وہ امر شہادت پر رونے کو ایک فکرِ غلط اور بے معنی نتیجہ تصوّر کرتے ہیں۔ جو معاشرے کو ضعیف اور کمزور بنا دیتا ہے۔

اپنے طالب علمی کے دور میں، میں نے محمد مسعود کی لکھی ہوئی اُس کتاب کا مطالعہ کیا تھا جس میں اُنھوں نے امام حسینؑ پر شیعہ حضرات کے رونے کے عمل کو عیسائیوں کی طرز فکر یعنی شہادت مسیح کے روز (ان کے عقیدہ کے مطابق) جشن اور خوشی منانے کے رویہ سے مقابلہ و مقایسہ کیا اور لکھا کہ ایک قوم اپنے رہبر کی شہادت پر روتی ہے کیونکہ وہ شہادت کو ایک عملِ مظلوم شکست خوردہ اور افسوس ناک سمجھتی ہے جبکہ دوسری قوم اپنے رہبر کی شہادت پر جشن اور خوشی مناتی ہے کیونکہ وہ شہادت کو ایک امر مطلوب اور افتخار آمیز تصور کرتی ہے۔ جس قوم نے شہید پر ہزار سال گریہ کیا، آہ و نالہ بپا کیے وہ اس عمل کی وجہ سے ایک بدبخت ڈرپوک اور میدان جنگ سے فرار کرنے والی قوم بن گئی، جبکہ دوسری قوم جس نے اپنے شہید پر دو ہزار سال سے جشن اور خوشی منائی ایک طاقتور اور فداکار قوم کہلائی۔

ایک ملّت نے اپنی طرز فکر کے ذریعہ شہادت کو شکست سمجھا اور اس منفی عمل پر گریہ کیا، آہ و نالہ بپا کیے جس کی وجہ سے وہ قوم ضعیف اور نحیف کہلائی لیکن دوسری قوم نے شہادت کو ایک عمل مثبت اور افتخار آمیز تصور کیا اور جشن و خوشی منائی، جس کی بدولت وہ دلیر اور طاقتور کہلائی، یہ تھی وہ بحث جس کو محمّد مسعود نے اپنی کتاب میں درج کیا تھا۔

میرا دل چاہتا ہے کہ اس مسئلہ پر بحث کروں اور یہ ثابت کروں کہ اتفاقاً یہ تعبیر برعکس ہے۔

اگرچہ کہ اس مقام پر میں ان افراد کی طرف داری نہیں کروں گا جو شہادت امام حسین علیہ السلام کو فقط ایک عملِ مظلومانہ اور ایک قتل بے گناہ سمجھ کر افسوس کرتے ہیں اور اس عمل پر گریہ کرتے ہیں۔ لیکن جن افراد نے علوم اسلامی کا مطالعہ کیا ہے اور مکتبِ اسلام سے واقف ہیں وہ فلسفۂ گریہ کو سمجھ کر اور شہادت کی قدر و منزلت کو جانتے ہوئے عزاداری اباعبداللہؑ کو بپا کرتے ہیں اور

اس میں شرکت کرتے ہیں۔

اولاً مجھے اس کی خبر نہیں کہ شہادت حضرت عیسیٰؑ اور اس پر جشن و خوشی منانے کے مسائل کو کب اور کس نے ایجاد کیا، لیکن اتنا ضرور پتہ ہے کہ دین اسلام نے شہید پر رونے کی تاکید کی ہے خصوصاً مذہب تشیعہ نے۔

اب بحث کے اصلی موضوع کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی شہادت اور موت کے فلسفہ کو اس شخص یا شخصیت کی جانب سے دیکھیں۔

کیا موت اُس شخصیت کے لیے ایک پسندیدہ عمل ہے اور وہ اس پر راضی ہے ہو کیا دوسرے افراد اس کی موت پر رضایت کا اظہار کرتے ہیں اور اس کی موت کو ایک شجاعانہ عمل اور اُس کا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس دُنیا میں بہت سے ادیان و مذاہب انسان اور اس کے دنیا کے ساتھ رابطہ یا بالفاظ دیگر روح اور بدن کے رابطہ کو ایک زندانی اور زندان، یا ایک پرندہ اور پنجرہ سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی ان کی نظر میں موت آزادی اور رہائی کا نام ہے بنابریں خودکشی ان مذاہب کی نظر میں فعل حرام نہیں بلکہ جائز ہے یعنی ان نظریوں کے تحت موت ایک عمل مثبت اور کامیابی ہے اور اس پر افسوس کرنے کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ زندان سے رہائی، یا قفس سے آزادی خوشی کا باعث ہوتی ہے اور اس پر غم نہیں منایا جاتا۔

بعض افراد موت کو ایک عمل تباہی، نابودی اور فنائی تصور کرتے ہیں اور اس کے برخلاف زندگی کو ایک عملِ وجودی اور ہستی کہتے ہیں۔ اور یہ ایک امر مسلم ہے کہ ہستی، نیستی پر، مثبت منفی پر اور وجود تباہی پر ترجیح رکھتا ہے، یعنی ان کی نظر میں زندگی کسی بھی طرح کی ہو ہر قسم کی موت پر ترجیح رکھتی ہے اور اس نظریہ کے تحت موت سو فیصد منفی ہے۔ ایک اور نظریہ کے تحت موت تباہی اور نابودی کا نام نہیں بلکہ اس دُنیا سے دوسری دُنیا میں منتقل ہونے کا نام ہے۔ اور اسی طرح سے روح اور بدن کا رابطہ پرندہ اور پنجرہ یا زندانی اور زندان کا رابطہ نہیں بلکہ یہ رابطہ ایک طالب علم اور مدرسہ یا باغبان اور باغ کی طرح کا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ایک طالب علم، علم کو حاصل کرنے کے لیے مصیبتیں، مشقتیں اٹھاتا ہے اور گھر سے دور وطن سے دور، غربت کے عالم میں، مدرسہ کے محدود علاقے میں رہ کر علم حاصل کرتا ہے تاکہ معاشرے میں سر بلند اور عزت و احترام کی زندگی گزار سکے اور اسی طرح ایک باغبان اپنے گھر کو چھوڑ کر صبح شام باغ میں کاشت کرتا ہے اور اسی کام کی بدولت وہ اپنے اہل و عیال کے لیے زندگی اور راحت کا سامان مہیا کرتا ہے، پس رابطہ دنیا و آخرت یا روح و بدن اسی قسم کا رابطہ ہے۔

جو افراد اس نظریہ کو قبول کرتے ہیں لیکن توفیق صحیح نہ ہونے کے بنا پر اپنی تمام عمر بدبختی اور بدکاری میں گزار دیتے ہیں مسلماً کسی بھی وقت موت کی آرزو نہیں کرتے، بلکہ وہ موت سے ڈرتے اور دور بھاگتے ہیں کیونکہ اپنے کیئے ہوئے اعمال سے ڈرتے ہیں۔

لیکن جن افراد نے اس نظریہ کو قبول کرتے ہوئے اپنی زندگی نیک کاموں میں صرف کی ہو اور ہمیشہ خدا کی راہ پر گامزن رہے ہوں وہ ہمیشہ موت کے مشتاق اور آرزومند ہوتے ہیں، ان کے قلب ہمیشہ موت کی آرزو میں دھڑکتے رہتے ہیں۔ ان کی مثال اس طالب علم کی سی ہے جو اپنی تعلیم کو پورا کرنے پر اپنے وطن کو پلٹنے کا مشتاق ہوتا ہے تاکہ اپنے دوستوں اور اپنے چاہنے والوں سے ملاقات کر سکے۔ یا اس باغبان کی مانند ہے جو کاشت کے پورا ہونے کا بے تابی انتظار کرتا ہے تاکہ جلد از جلد اس کے ثمرہ کو اپنے گھر لے جائے۔

اولیاء خدا یا دوستانِ خدا اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہونے کے عمل کو موت کہتے ہیں۔ موت ان افراد کی دیرینہ آرزو ہے اور وہ بے قراری سے اس آرزو کی تکمیل کے مشتاق رہتے ہیں۔ بقول حضرت علی علیہ السلام، اگر خداوندِ عالم اولیاء خدا کے لیئے موت کا وقت معین نہ فرماتا تو عاقبت کے خوف اور ثوابوں کے شوق میں ان افراد کی روحیں ان کے بدن سے خود بخود پرواز کر جاتیں۔

ان تمام مسائل کے باوجود اولیاء خدا موت کو حاصل کرنے کے لیئے کوشاں نہیں رہتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عمر ایک فرصت ہے جس میں عبادت اور عمل صالح انجام دیئے جاسکتے ہیں اور یہ فرصت جتنی بھی زیادہ ہو اتنے ہی انسانی کمالات اجاگر ہوں گے۔ چنانچہ اسی لیئے وہ طول عمر کے طالب ہوتے ہیں۔

لہذا معلوم ہوا کہ اس نقطہ نظر کے مطابق، موت کا مشتاق ہونا، موت کی آرزو کرنا، اور خداوندِ عالم سے عبادت کے لیئے طول عمر کی دعا کرنا، کسی بھی طرح سے ایک دوسرے کے برخلاف نہیں۔

قرآن کریم ان یہودیوں کے بارے میں جو اپنے لیئے خدا کا دوست (اولیاء اللہ) ہونے کا دعویٰ کرتے تھے فرماتا ہے:

"اگر تم لوگ خدا کے سچے دوست ہوتے تو موت تمھارے
لیئے ایک پسندیدہ عمل اور ایک دیرینہ آرزو ہوتی، لیکن تم
لوگ ہرگز موت کی آرزو نہیں کرتے کیونکہ ظلم و جبر کے
اعمال نے جو تم لوگوں سے سرزد ہوئے ہیں تم کو اس
جہان میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔

اولیاء خدا دو مقام پر طول عمر کی دعا نہیں کرتے۔ ایک جبکہ انھیں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اپنی کمزوری اور ضعف کی بناء پر عبادت میں خلل یا کوتاہی واقع

ہو رہی ہے۔ حضرت علی ابن الحسین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِلٰهِیْ وَ عَمِّرْنِیْ مَادَامَ عُمُرِیْ بِذْلَةً فِیْ طَاعَتِكَ فَاِذَا كَانَ مَرْتَعًا لِلشَّیْطَانِ فَاقْبِضْنِیْ اِلَیْكَ۔

"پروردگارا مجھے صرف اتنی زندگی دے کہ تمام زندگی تیری عبادت میں صرف ہو جائے اور اگر قرار ہو کہ میری زندگی شیطان کی چراگاہ بنے تو مجھے جلد از جلد اس دنیا سے اٹھا لے۔

دوسرا مقام "شہادت" ہے جہاں اولیاء خدا طول عمر کی دعا نہیں کرتے، بلکہ ہمیشہ موت کو شہادت کی شکل میں طلب کرتے ہیں کیونکہ شہادت دو خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ اوّل شہادت ایک عمل صالح اور شجاعانہ امر ہے اور خداوند عالم کے نزدیک کوئی بھی نیکی یا عمل صالح شہادت سے بلند تر اور آفرین تر نہیں ہے، دوسرے شہادت اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہونے کا نام ہے جو اولیاء خدا کی دیرینہ آرزو ہوتی ہے۔

چنانچہ اسی لیئے جب حضرت علی علیہ السلام کو موت شہادت کی شکل میں نصیب ہوئی تو آپ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ حضرت علی علیہ السلام نے ضربت لگنے کے بعد بستر شہادت پر کئی اہم سخن ارشاد فرمائے ہیں جو نہج البلاغ میں محفوظ ہیں فرماتے ہیں:

"وَ اللّٰهِ مَا فَجَأَنِیْ مِنَ الْمَوْتِ وَارِدٌ كَرِهْتُهُ وَلَا طَالِعٌ اَنْكَرْتُهُ وَ مَا كُنْتُ اِلَّا كَقَارِبٍ وَرَدَ وَ طَالِبٍ وَجَدَ

"خدا کی قسم کوئی ناگہاں اتفاق مجھ پہ نازل نہیں ہوا، مجھے وہی چیز نصیب ہوئی جس کی میں ہمیشہ آرزو اور انتظار کرتا تھا (جو شہادت ہے) میری مثال اُس شخص کی طرح ہے جو رات کی تاریکی میں پانی کو پانے کے لیئے صحرا کے چکر لگائے اور پانی کا چشمہ اُسے نظر آجائے۔"

اکیسویں رمضان کی سحر جب دشمن کی تلوار نے علی علیہ السلام کے فرقِ مبارک کو کاٹا تو آپ نے فرمایا:

"فزت و رب الکعبہ"

"کعبہ کے پروردگار کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔"

پس معلوم ہوا شہادت اسلام کی نظر میں اس شخص یا شخصیت کے لیئے نہ صرف ایک عمل پسندیدہ اور آرزو ہے بلکہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔

امام عالی مقام حضرت امام حسین سید الشہداء علیہ السلام فرماتے ہیں:

"پیغمبر اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بشارت دی کہ حسینؑ تیرا درجہ خداوند عالم کے پاس اتنا بلند ہے کہ اُسے شہید ہوئے بغیر حاصل نہیں کر سکتے۔"

پس امام حسین علیہ السلام کی شہادت، خود آپ کی شخصیّت کے لیئے ایک بلند و باوقار مرتبہ جو عالی ترین درجات کا حامل ہو تصور کیا جاتا ہے۔

اس مقام تک ہم نے فلسفہ موت و شہادت پر اس شخص یا شخصیت کی جانب سے بحث کی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر موت شہادت کی شکل میں حاصل ہو تو یہ شہید کے لیے ایک امتیاز اور خوشی و خوشحالی کا موقع ہے۔ چنانچہ اسی لئے

سیدابن طاؤس فرماتے ہیں :

"اگر ہمیں عزاداری کرنے کا دستور نہ دیا جاتا تو ہم بھی تمام آئمہ اطہار کی شہادتوں پر جشن مناتے ۔ لہذا ہم عیسائیت کو جس کی نظر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام شہید تصور کیے جاتے ہیں اس بات کا حق دیتے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے روز شہادت جشن اور خوشی منائے ۔"

اب اسلام کی روشنی میں تصویر کے دوسرے رُخ کا بھی بغور مطالعہ کریں، یعنی شہادت کو معاشرہ کی نظر میں، یا جامعہ کے افکار اور تاثرات شہید اور اس کے کارنامہ کی بابت معلوم کریں ۔

شہید اپنے اجتماع سے دو قسم کے تعلقات کا حامی ہوتا ہے ۔ ایک وہ لوگ جو اس کے چاہنے والے اور اس کے پیرو ہوتے ہیں اور شہادت کی وجہ سے شہید کے علم و فیض سے محروم ہو جاتے ہیں اور شہادت ان افراد کے لیے ایک عمل تاثر آور اور غم گین تصور کیا جاتا ہے چنانچہ وہ اس غم و الم میں گریہ زاری کرتے ہیں۔

دوسرے وہ افراد جنھوں نے شہید کی آواز کو روکنے کے لیئے فساد اور تباہی کے سامان مہیا کیے اور جن سے لڑتے ہوئے شہید نے شربت شہادت نوش کیا اور شہید کی ناموجودگی ان افراد کے لیے یہ اُمر باعثِ خوشی اور جشن تصور کیا جاتا ہے ۔

شہادت ایک نیک عمل ہے جو ایک واقعہ بد کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے ۔ یعنی ایک آپریشن کی طرح ہے، جو ایک بیماری بد مثلاً اپنڈیسٹ یا زخم معدہ کو خارج کرنے کے لیئے کیا جاتا ہے چنانچہ اگر اپنڈیسٹ یا زخم معدہ نہ ہو تو آپریشن

کی ضرورت نہیں ہوتی اور اس مورد میں آپریشن کرنا خود ایک غلطی تصور کیا جاتا ہے۔

عوام کو چاہیئے کہ شہادت سے درس حاصل کریں ۔ یعنی اوّلاً معاشرہ میں ایسا ماحول نہ بننے دیں اور اس بات کی اجازت نہ دیں کہ چند افراد ظلم اور قتل کے علمدار کہلانے لگیں جیسے یزید اور ابن زیاد وغیرہ، جن کے نام بھی قیامت تک قابلِ نفرین و ملامت رہیں گے ۔

دوسرے اگر ایسا ماحول بنے کہ شہادت کی ضرورت محسوس ہو تو شہید کے دلیرانہ عمل کو (جس کو اس نے خود انتخاب کیا ہو) دوسروں تک پہنچائیں تا کہ عوام کے احساسات شہید کی فکر اور اس کے احساس سے ہم آہنگ ہو جائیں ۔

اسی لیئے ہم کہتے ہیں شہید پہ گریہ کرنا اس کے دلیرانہ عمل میں شرکت' اس کی روح کے ساتھ ہم آہنگی اور اس کی خوشی و اقدام سے موافقت کا نام ہے ۔ اس مقام پر ہم اس مسئلہ کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آیا عیسائیوں کے جشن میں جو رقص و آواز اور شراب خوری کی محفلیں سجائی جاتی ہیں ۔ عوام کے احساسات کو شہید (ان کے مطابق) کے احساسات سے ہم آہنگ اور ہم قدم کرتی ہیں یا گریہ کام انجام دیتا ہے ۔

بعض افراد گریہ کو انسانیت سے گرا ہوا عمل یا بزدلانہ کام تصور کرتے ہیں ۔ جبکہ ہنسنا اور رونا دو اہم خصوصیات ہیں اور حیوان ان خصوصیات سے دور ہے ۔ ہنسنا اور رونا انسان کے حساس اور احساساتی ہونے کی دلیل ہے ۔ رونے کی طرح ہنسنے کے بھی کئی اقسام ہیں (جن پر میں بحث کرنا لازم نہیں سمجھتا)، آنسو بہانا، رقّت کے ساتھ رونا یا خوشی کے آنسوؤں کو کون نہیں جانتا، رونا ایک ایسا امر ہے کہ انسان روتے وقت اپنے محبوب سے نزدیک ہوتا ہے اور اپنے آپ کو محبوب سے منسلک کر دیتا ہے ۔ مستی اور خوشی انسان کو خود غرضی، شہوت اور لذت کی طرف لے جاتی ہے جبکہ نالہ و زاری انسان کو

اس کے محبوب سے نزدیک کر کے اس کے عشق سے سرشار کرتی ہے۔ اور انسان خودی کو بھول کر عشقِ حقیقی میں گم ہو جاتا ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے اپنی عالی شان شخصیت اور پر امتیاز شہادت کی بناء پر لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کے دلوں پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔ اگر علمائے دین اور رہبرانِ ملت اس گنج بزرگ یعنی شہادت امام حسین علیہ السلام کو عوام اور ملت کے سامنے حقیقی جلوہ دیں اور عوام کے احساسات اور ان کی رُوح کو اس شہادت سے سبق حاصل کرنے کی ہدایت کریں تو تمام دنیا سُدھر سکتی ہے۔

حسینیتؑ کی زندگی کا اصلی راز تفکر امام حسین علیہ السلام تھا جو ایک عمل صالح اور منطقی ہونے کے علاوہ عقل کی حمایت سے کاملاً برخوردار تھا جو جذبۂ عشق اور احساسات کی گہرائیوں سے جاری ہوا تھا۔

آئمہ اطہارؑ نے امام حسین علیہ السلام پر جو رونے کی سخت تاکیدیں کی ہیں وہ حکمت اور منطق سے خالی نہیں کیونکہ یہ آنسو ہی ہیں جو قلب تک اُتر جاتے ہیں اور انسان کو متاثر کیئے بغیر خشک نہیں ہوتے۔

قبرِ شہید کی اہمیّت

جب پیغمبرِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو تسبیحات پڑھنے کے لیے فرمایا (یعنی ۳۴ بار اللہ اکبر، ۳۳ بار الحمد للہ ۳۳ بار سبحان اللہ۔ تو حضرت فاطمہؑ، حضرت حمزہؑ کی قبر پر گئیں اور آپ کی تربت کی خاک سے تسبیح بنائی۔

حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے یہ عمل کیوں کیا۔ اگر تسبیح کے دانے

لکڑی یا معمولی مٹی کے ہوں تو کوئی فرق حاصل ہوتا ہے ؟ یہ عمل اس امر کی دلیل ہے کہ شہید کی قبر کی مٹی قابلِ احترام ہے۔ شہید کی قبر کا مرتبہ بلند و بالا ہے۔ یہ ایک قسم کا احترام ہے جو شہید اور اس کی شہادت کو دیا جاتا ہے جو شہادت کے مقام و منزلت کو اُجاگر کرتا ہے۔

واقعہ کربلا کے بعد ہم قبر حسین علیہ السلام کی خاک کو تبرک کے طور پر استعمال کرتے ہیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ خدا نے سجدہ کو لباس و فرش پر جائز قرار نہیں دیا بلکہ سجدہ صرف مٹی اور پتھر پر کیا جا سکتا ہے جیسا کہ ہمارے ائمہ اور علماء نے فرمایا ہے اب جبکہ سجدہ خاک پر کیا جائے تو بہتر ہے کہ یہ خاک شہید کی قبر کی خاک ہو اور اگر کربلا کی خاک مل جائے تو اس میں شہید کے خون کی بُو بھی رہے گی۔ پس جبکہ ہم نماز پڑھ رہے ہوں اور ہر قسم کی خاک پر سجدہ روا ہو تو اگر ہمارا سر اس خاکِ مقدس پر ہو جو شہید کی قبر سے نزدیک اور شہید کے خون کی بُو دے تو اس نماز کا ثواب سو برابر ہو گا۔

امام فرماتے ہیں:

> "سجدہ کرو میرے جد امام حسین علیہ السلام کی تربت پر، کیونکہ جس نمازی نے اس تربت پر سجدہ کیا اس نے سات پردوں کو ہٹایا اور شہید کے مقام و منزلت کو پہچانا اور اس خاک نے اس کی نماز کے مرتبہ کو بلند و بالا کیا۔"

شبِ عاشورہ

آج کی رات ہم کس لیئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ آج کی شب کس کی شب

ہے۔ آج کی شب شبِ شہید ہے۔

ہماری دنیا کا رواج ہے کہ بعض روز بعض افراد یا گروہوں کے نام سے موسوم اور مخصوص ہیں مثلاً روز مادر، روزِ اُستاد وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہم نے اسلام کے سوا کہیں نہیں دیکھا کہ ایک روز شہید کے نام سے بھی موسوم ہو۔ اسلام نے ایک دن کو شہید کے لیے مخصوص کیا اور وہ روز روزِ عاشور ہے اور آج اس کی شب (شبِ عاشور) ہے جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں شہید کے فلسفہ یا شہید کی منطق کے دو پہلو ہیں۔ ایک شہید کا عشقِ الٰہی سے منسلک ہونا اور دوسرا اس کی شہادت کی بدولت اجتماع کی خدمت کرنا۔ یعنی اگر ان دو شخصیتوں زاہد اور مصلح کو ایک جگہ جمع کریں تو ایک شہید وجود میں آتا ہے۔ بالفاظِ دیگر شخصیت "مسلم ابن عوسجہ" "حبیب ابن مظاہر"، "زُہیر ابن قین" وجود میں آتی ہے۔ اگرچہ تمام شہیدوں کے درجات و مراتب جُدا جُدا ہیں۔

امام حسینؑ نے اصحاب و اہلبیتؑ پر اپنی حجّت تمام کی

جب نویں محرم کو یہ بات طے پائی کہ دسویں کی سحر حق اور باطل کے درمیان جنگ و معرکہ کا پیغام لائے گی اور صرف ایک شب کی مہلت باقی رہ گئی ہے۔ تب امام حسین علیہ السلام نے اپنے تمام اہلبیتؑ اور اصحاب کو جمع کیا۔ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں کہ جس خیمہ میں ان افراد کو جمع کیا گیا تھا وہ خیمہ میرے خیمہ سے متصل تھا۔ چنانچہ آپ کے قول کے مطابق امام نے ایک تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جو آپ کی فصاحت و بلاغت و منطق سے سرشار تھا۔

پہلے آپ نے خدا کی تعریف کی اور فرمایا:

"أُثْنِي عَلَى اللهِ أَحْسَنَ الثَّنَاءِ وَ أَحْمَدُهُ علی السّراءِ وَالضَّراءِ اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَحْمَدُكَ على ان اكرمتنا بالنُّبوَّةِ۔ و علمتنا القرآن و فقهتنا فی الدین"

"میں خدا کی حمد و ثناء میں مشغول ہوں جو عالی ترین عبادت ہے۔ میں نے ہمیشہ خدا کی شکر گزاری کی ہے اور اب بھی ہر حال میں اور ہر مقام پر اس کا شکر گزار ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو افراد راہ مستقیم پر گامزن ہوں، ہر مقام پر اور ہر حال میں خدا کے شکر گزار اور اس سے راضی رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے وعدہ کے پکے ہوتے ہیں اور اپنے وعدہ کو پورا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے اور اس راہ میں آئی ہوئی ہر مشکل کا خوشی سے استقبال کرتے ہیں۔"

فرزدق اپنے زمانے کا ایک مشہور شاعر تھا، جب اس نے عراق اور کوفہ کے حالات کو امام کے لیئے نامناسب اور خطرناک بتلایا۔ تب امام نے فرمایا:

"ان نزل القضاء بما نُحِبّ فنحمد الله على نعمائه و هو المستعان على اداءِ الشكر و ان حال القضاء دون الرجاء فلم يتعدّ (فلم يبعد) من كان الحق نيّته والتقوىٰ سريرته"

"اگر حالات نے ہماری خواہش کے مطابق رُخ اختیار کیا تو ہم اللہ کی حمد و ثنا کریں گے اور اس کا شکر ادا کرنے کے لئے اُس سے مدد چاہیں گے اور اگر حالات مساعد نہ ہوئے تب بھی ہم گھاٹے میں نہیں رہیں گے کیونکہ ہماری نیت نیک ہے اور ہمارا ضمیر صاف ہے۔ پس جو کچھ بھی پیش آئے وہ خیر ہے شر نہیں۔ ہم تمام حالات میں خواہ وہ خوشگوار ہوں یا نہ ہوں، اللہ کے شکر گزار ہیں۔"

امام علیہ السلام کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں اچھے بُرے دونوں قسم کے دن دیکھ رکھے ہیں۔ اچھے دن وہ تھے جب میں رسولِ اکرمؐ کی گود میں بیٹھتا تھا اور اُن کے کندھوں پر سوار ہوتا تھا۔ ایک وقت وہ تھا جب میں اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ چہیتا بچہ تھا۔ ان دونوں کے لئے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں موجودہ مشکلات کے لئے بھی اس کا شکر گزار ہوں کیونکہ میں انھیں بُرا نہیں سمجھتا بلکہ خیر سمجھتا ہوں۔

پھر آپ نے اپنے ساتھیوں اور اپنے اہل بیتؑ کے بارے میں تاریخی گواہی دی۔ آپ نے فرمایا:

"اِنِّی لَا اَعْلَمُ اَصْحَابًا خَیْرًا وَّلَا اَوْفیٰ مِنْ اَصْحَابِیْ وَلَا اَهْلَ بَیْتٍ اَبَرَّ وَ لَا اَوْصَلَ وَلَا اَفْضَلَ مِنْ اَهْلِ بَیْتِیْ۔"

"مجھے اپنے اصحاب سے بہتر اور زیادہ وفادار کسی اصحاب کا علم نہیں اور نہ ہی میں کوئی اعزّہ و اقربا جانتا ہوں جو میرے اعزّہ و اقربا سے زیادہ نیک اور زیادہ فرض شناس ہوں۔"

یہ فرما کر آپ نے اپنے ساتھیوں کو رسولِ اکرمؐ کے اُن صحابہ سے افضل قرار دیا جو آنحضرتؐ کے ہمراہ جنگوں میں شریک ہوئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے اور انہیں اپنے والد بزرگوار امام علیؑ کے ان ساتھیوں سے بھی افضل قرار دیا جنھوں نے جمل، صفین اور نہروان کی جنگوں میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا کیونکہ آپ کے ساتھیوں کے حالات ان لوگوں سے زیادہ سخت تھے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے کسی ایسے اعزہ واقربا کا علم نہیں جو میرے اعزہ واقربا سے زیادہ نیک اور وضع شناس ہوں۔ پھر آپ نے اپنے اعزہ کے بلند مقام اور رتبے کا اعتراف کیا اور اُن کا شکریہ ادا کیا۔

پھر آپ نے فرمایا:

"حاضرین! میں اپنے ساتھیوں اور عزیزوں سمیت آپ سب کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان لوگوں (دشمن کی افواج) کو میرے علاوہ کسی سے کوئی غرض نہیں۔ یہ مجھے اپنا واحد دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ مجھ سے بیعت لینا چاہتے ہیں۔ اگر میں نہ رہوں تو یہ تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔

تم نے مجھ سے بیعت کی ہے۔ اب میں تمہیں تمہارے عہد سے آزاد کرتا ہوں۔ تم ہرگز یہاں رہنے کے پابند نہیں ہو۔ تمہیں کوئی دوست یا دشمن مجبور نہیں کر رہا۔ تم قطعاً آزاد ہو۔ تم میں سے جو کوئی جانا چاہے جا سکتا ہے۔"

پھر آپ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

"تم لوگ میرے عزیزوں میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑو اور چلے جاؤ۔" امام حسینؑ کے اعزہ میں چھوٹے بڑے دونوں قسم کے لوگ شامل تھے

علاوہ ازیں وہ یہاں اجنبی تھے۔ لہٰذا امام علیہ السلام یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ سب کے سب اکٹھے روانہ ہوجائیں۔ اسی لئے آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑیں اور میدانِ جنگ سے نکل جائیں۔

یہ واقعہ امام حسین علیہ السلام کے ساتھیوں کے بلند کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔ انہیں کسی قسم کی کوئی مجبوری نہ تھی۔ دشمن کو ان سے کوئی سروکار نہ تھا۔ امام علیہ السلام نے انہیں ان کی ذمّے داری سے آزاد کر دیا تھا۔ ان حالات میں جو ایمان افروز جوابات امام حسینؑ کے اصحاب اور اعزّہ نے فرداً فرداً آپ کو دئے وہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے کچھ اقتباسات نیچے درج کئے جاتے ہیں:

شہید کی شجاعت

روزِ عاشور اور شبِ عاشور امام حسینؑ یہ دیکھ کر بڑی خوشی محسوس کر رہے تھے کہ سب کے سب کم سن بچے سے لے کر سب سے سن رسیدہ شخص تک آپ کے سب اقربا آپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔

آپ کے لئے ایک اور مسرّت انگیز چیز یہ تھی کہ آپ کے کسی ساتھی نے بھی رتّی بھر کمزوری کا اظہار نہیں کیا۔ ان میں سے کوئی بھی آپ کو چھوڑ کر دشمنوں سے نہیں جا ملا۔ اس کے برعکس وہ کئی ایک مخالفین کو اپنی طرف لے آئے۔ ایسے لوگ عاشور کے دن اور اس سے پہلی رات کو آکر ان کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ انہیں میں ایک حُرؓ بن یزید ریاحی تھے۔

شبِ عاشور جو لوگ آکر امامؑ کے ساتھیوں میں شامل ہوئے اُن کی تعداد تیس تھی۔ یہ چیز امام علیہ السلام کے لئے بڑی اطمینان بخش تھی۔

امام حسینؑ کے ساتھیوں نے یکے بعد دیگرے آپ سے عرض کیا:

آقا! کیا آپ ہمیں اجازت دے رہے ہیں کہ ہم آپ کو تنہا چھوڑ کر چلے جائیں؟ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے مقابلے میں ہماری زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔"

اُن میں سے ایک نے کہا:-

"میں چاہتا ہوں کہ میں مارا جاؤں اور میرا بدن جلا کر میری راکھ بکھیر دی جائے اور یہ عمل آپ کی خاطر ستر بار دہرایا جائے۔ ایک بار قتل ہونا تو کوئی چیز ہی نہیں۔"

ایک اور نے کہا:

"میں چاہتا ہوں کہ میں مسلسل ہزار دفعہ قتل کیا جاتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری ہزار جانیں ہوتیں جنھیں میں آپ پر نچھاور کر دیتا۔"

پہلے شخص جنہوں نے یہ الفاظ کہے امامؑ کے دلاور بھائی حضرت ابوالفضل العباسؑ تھے۔ ان کے بعد باقی سب نے اسی طرح کے جملے دہرائے۔

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

یہ اُن کی آخری آزمائش تھی۔ جب سبھی اپنے فیصلے کا اظہار کر چکے تو امام حسین علیہ السلام نے انھیں بتایا کہ دوسرے دن کیا ہونے والا ہے۔ آپ نے فرمایا:

"میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ کل تم سب شہید ہو جاؤ گے۔"

اُن سب نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ انھیں اس بات کا موقع مل رہا ہے کہ دوسرے دن فرزندِ رسولؐ کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔

یہاں کچھ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اگر سوال شہید کی منطق کا نہ ہوتا تو یہ

کہا جا سکتا تھا کہ ان لوگوں کا کربلا میں ٹھہرنا بیکار تھا۔ اگر امام حسینؑ کو بہرحال قتل ہونا ہی تھا تو ان لوگوں کو جانیں قربان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ حضرات کیوں وہاں ٹھہرے رہے امام حسینؑ نے انھیں ٹھہرنے کی اجازت کیوں دی؟ انھیں کیوں مجبور نہ کیا گیا کہ وہ چلے جائیں انہیں کیوں نہ کہا کہ کسی کو تم سے سروکار نہیں اور تمہارے یہاں ٹھہرنے کا ہمیں بھی کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا واحد نتیجہ یہ ہوگا کہ تم بھی اپنی جانیں گنوا بیٹھو گے لہٰذا تمہیں چلے جانا چاہیے

تمہارا جانا واجب ہے اور یہاں رکنا حرام ہے۔ اگر ہم جیسا کوئی شخص امام حسینؑ کی جگہ ہوتا اور شرع کی مسند پر بیٹھا ہوتا اور قلم اس کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ لکھتا کہ میرا فیصلہ یہ ہے تمہارا یہاں مزید رکنا حرام اور جانا واجب ہے اور اگر تم یہاں ٹھہرے رہے تو اس گھڑی کے بعد تمہارا سفر گناہ ہوگا اور تمہیں قصر کی بجائے پوری نماز پڑھنی چاہیئے

لیکن امام حسینؑ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اس کے برعکس انہوں نے ان لوگوں کی جانیں قربان کر دینے پر آمادگی کا خیر مقدم کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک شہید کی منطق دوسرے لوگوں کی منطق سے مختلف ہوتی ہے۔ ایک حق پرست مجاہد اپنی جان کی قربانی اس لئے دیتا ہے تاکہ لوگوں کے دلوں میں جوش و خروش پیدا کر سکے۔ معاشرے کو روشن خیال بنا سکے۔ اس میں نئے سرے سے جان ڈال سکے اور اس کے بدن میں تازہ خون داخل کر سکے۔ یہ ایک ایسا ہی موقع تھا۔

شہادت کا واحد مقصد دشمن کو شکست دینا نہیں ہوتا۔ یہ جوش و خروش بھی پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس دن امام حسینؑ کے ساتھی اپنی جانیں نثار نہ کر دیتے تو اس قدر جوش و خروش کیسے پیدا ہو سکتا تھا؟ گو شہادت کے واقعہ میں امام حسین علیہ السلام مرکزی شخصیت کے حامل تھے لیکن ان کے ساتھیوں کی شہادت نے خود ان کی شہادت کی شان و شوکت اور وقار میں اضافہ کیا۔ ممکن تھا کہ ان کی شرکت کے بغیر امام حسینؑ کی شہادت کو

اتنی اہمیت حاصل نہ ہوتی کہ لوگ اس سے متاثر ہوں، سبق سیکھیں اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال تک جوش اور ولولے سے سرشار رہیں۔

آخر میں ہم اللہ تعالیٰ کے بے پایاں لطف وکرم میں پناہ ڈھونڈتے ہیں اور آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ دعا کریں کہ وہ پروردگار عالم ہم سب کو توفیق دے کہ ہم اپنی خواہشات کو اس کی مرضی کے تابع کردیں اور ہم پر اپنی برکتیں نازل کرے اور اپنی راہ میں شہادت کا رتبہ بخشے۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ

(سورۃ الشعراء آیت ۲۲۷)